**ڈاکٹر صدف بخاری**
شعبہ اردو کنیئرڈ کالج برائے خواتین
لاہور

# منیؔر نیازی کی چند اہم نظمیں

The aim of this paper is to explore MunirNiazi's uniqueness as a poet of modern Urdu nazm. His poetry is a collective tapestry of images strongly rooted in anthropology, mythology and surrealism. Munir'snazm develops an understanding of the human experiences and broadens the human consciousness. His poetic expression is a blend of innocence, simplicity and bewilderment. An important aspect of his nazm is to reveal quite inexplicable feelings and forgotten but most precious moments. He describes the fear and insecurity of postmodern life in its primitive and archetypal perspective. By virtue of his thematic diversity and stylistic variations Munir stands tall amonghis contemporaries.

منیؔر نیازی کی نظم نئی نظم میں ایک مخصوص انفرادیت کی حامل ہے جسے نہ تو ہم اپنے عہد کی نظم سے انحراف کی صورت کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی لسانی وفکری سانچے توڑتی ہوئی بغاوت قرار دے سکتے ہیں بلکہ اس نظم میں معاصر لہجے کا تمام جوہر کشید ہوتا نظر آتا ہے لیکن اندازِ بیان ایسا ہے کہ اس پر کسی اثر پذیری کی چھاپ نظر نہیں آتی۔

منیؔر نیازی نے اپنے عہد کے کسی مروج نظریے کو اپنایا اور نہ ہی کسی ادبی یا سیاسی رجحان کی تقلید کی جس کے باعث وہ منفرد تو رہے لیکن انہیں قبول عام حاصل کرنے میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی وہ قیمت ہے جو اپنی انفرادیت کی بنا پر ہر سچے اور کھرے فنکار کو ادا کرنا پڑتی ہے۔ مجیؔد امجد نے منیؔر نیازی کی کتاب ''جنگل میں دھنک'' کا تعارف لکھتے ہوئے بہت پہلے ہماری توجہ اسی تنقیدی بے انصافی کی طرف دلائی تھی جس کے باعث اپنے عہد کے کسی بھی اہم فنکار کی صلاحیتوں کا صحیح معنوں میں اعتراف نہیں کیا جاتا۔ منیر کے ہاں یقیناً اس کی ایک نہایت اہم وجہ ان کا خالصتاً فنکار ہونا ہی ہے اس حوالے سے مجیؔد امجد لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔۔ اور لوگوں کے ساتھ تال گروں کی ٹولیاں تھی، عظیم نظریوں کے کوکبہ ہائے جمال تھے، مسندیں تھیں، اورنگ تھے۔ منیر نیازی کے پاس کیا تھا؟۔ کوئی سایہء دیوار بھی نہ تھا۔ صرف شعر کہنے کی دھن ، یوں اپنے آپ میں تنہا اس نے اپنی زندگی کی ایک ایک تڑپ ، اپنے تجربات کی ایک ایک کسک ہوا کے جھونکوں کی سلوٹوں سے تراشی ہوئی سطور میں رکھ دی۔ آج سیم وزر کی قدروں میں کھوئی ہوئی یہ مخلوق جنگل کی اس دھنک کو کیا دیکھے گی، اس صحیفے کو رکھ دو۔ سجا کر رکھ دو اس اونچی الماری میں! ابھی اس بازار سے جانے کتنی نسلوں کے جلوس اور گزریں گے! یہ جلوس ہنستے

کھیلتے قہقہے لگاتے مہ وسال کے غبار میں کھو جائیں گے۔ زمانے کی گرد میں ہم سب اور منیر بھی۔ لیکن خیال اور جذبے کی ان دیکھی دنیاؤں کے پرتو فطرت کے رنگوں اور خوشبوؤں میں تحلیل ہوتی نظروں کی جاگرتی، تیرتی بدلیوں کے سایوں میں روتے دلوں کی کروٹ جو اس کے شعروں اور شبدوں میں مجسّم اور جاوید ہوکر رہ گئی ہے۔ اردو نظم کے مرحلہ ہائے ارتقاء کی ایک جاندار کڑی ہے۔ کون ان نقوش کو بھلا سکے گا۔''[1]

مجید امجد کی اسی تنقیدی بصیرت کی بنا پر آج ہم دیکھتے ہیں کہ منیر نیازی کی نظم واقعی جدید نظم کے ارتقا میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ یہاں منیر نیازی کی چند نظموں کا فکری وفنی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ ان کی انفرادیت کے رنگ نمایاں ہوسکیں۔

منیر نیازی تک آتے آتے اردو نظم حسنِ فطرت کی انوکھی پیش کش پر قادر نظر آتی ہے یہی وجہ ہے کہ منیر نیازی منظروں اور موسموں کی خارجی تفصیل کے برعکس ان کی لائی تبدیلیوں اور اثرات کو بھی موضوع سخن بناتے ہیں اور یہ اثرات اجتماعی نوعیت کے نہیں انفرادی اور امکانی ہیں۔ یہاں ہر تبدیلی طے شدہ تاثرات کی حامل نہیں بلکہ وارداتِ دل کی رہینِ منت ہے۔ مظاہرِ فطرت کی نمود یہاں تمثیلی اور استعاراتی آرائش کے لیے نہیں بلکہ خود موضوع سخن ہے۔ منیر نیازی کی ابتدائی نظموں میں حسنِ فطرت سے ایک خاص لگاؤ نظر آتا ہے جو کہ آخر تک قائم رہتا ہے لیکن اس کی صورتِ اظہار بتدریج بدلتی چلی جاتی ہے۔ مظاہر فطرت کی پیش کش کا رجحان جدید اردو نظم میں انگریزی نظم کے وسیلے سے بھی آیا نظموں کے انگریزی سے اردو تراجم اس سلسلے میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

انگریزی نظم کا موسموں اور منظروں سے اثر پذیر ہونے کا انداز اردو نظم کے مزاج میں بھی رچ بس گیا اور نئے لکھنے والوں نے اس تقلید کو حسنِ تخلیق سے ہم آمیز کر کے کچھ اس انداز میں پیش کیا کہ اب یہ ہمیں بہت مانوس اور اپنائیت سے بھرپور نظر آتا ہے۔

انگریزی کے مابعد الطبیعاتی شاعروں (Mataphysical Poets) اور رومانوی شاعروں، جان ڈن، ڈانٹے، ورڈزورتھ، کولرج اور شیلے وغیرہ کے اثرات اس سلسلے میں خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ منیر نیازی کی نظم حسنِ فطرت کے بیان میں انگریزی شاعری کے اسی رویے کو آگے بڑھاتی ہے جہاں جابجا شاعر حسنِ فطرت سے اپنا ایک رشتہ بناتا ہوا نظر آتا ہے۔

منیر نیازی فطرت کے حسن کو موضوع بناتے ہیں تو ایک سحر پیدا کر دیتے ہیں اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب نئی نظم انگریزی نظم کے مقابل گئی ہے کیونکہ منیر نیازی سے پہلے نئی نظم میں یہ جادو ئی فضا اتنی انفرادیت سے نظر نہیں آتی۔ منیر نیازی کی وہ چند اہم نظمیں جن میں فطرت کا حسن ایک مسحور کن کیفیت پیدا کرتا ہے یہ ہیں:

برسات، آمدِ شب، میں اور بادل، صدا بصحرا، ہوا کا گیت، سیرِ سحر آبِ زارِ بنگال، بے سود سفر کے بعد آرام کا پل، دوست ستارے کو چمکتے رہنے کا اشارہ، آغاز زمستان میں دوبارہ، نیا سال، چھ رنگین دروازے، صبحِ صادق کا پھیلاؤ، سورج گرہن کے دن، ستمبر کی ہوا، ہرا درخت، سیاہ شب کا سمندر اور سفید دن کی ہوا، سحر ہوگئی، چلتی ہوا۔

''صدا بصحرا'' منیر نیازی کی نہایت اہم نظموں میں سے ایک ہے اس نظم کی انفرادیت اس کے ہر مصرعے سے عیاں ہے۔

''چاروں سمت اندھیرا گھپ ہے اور گھٹا گھنگھور
وہ کہتی ہے ''کون ۔۔۔؟''

میں کہتا ہوں ''میں ۔۔۔''

کھولو یہ بھاری دروازہ

مجھ کو اندر آنے دو۔۔۔''

اس کے بعد اک لمبی چپ اور تیز ہوا کا شور

(تیز ہوااور تنہا پھول)

اس نظم کا لینڈ سکیپ گھپ اندھیرے، گھنگھور گھٹا اور تیز ہوا کے شور سے تیار ہوتا ہے جس میں ایک انسانی مکالمہ ہے جو کسی مقفل بھاری دروازے کو کھولنے کیلئے سامنے آتا ہے اور اپنا بھرپور اثر چھوڑ جاتا ہے قاری کا ذہن فطرت کی اس منہ زور یورش میں پیدا ہونے والے یا ہوسکنے والے امکانات کو سوچتا ہے اس نظم کو Walter De Lamare کی نظم The Listeners کے مماثل بھی قرار دیا گیا خصوصاً اشفاق احمد ''تیز ہوا تنہا پھول'' کے دیباچے میں سرِ کہسار کے عنوان سے لکھتے ہیں:

> طالب علمی کے زمانے میں (اور اس کے بعد بھی) ہم والٹر دی لامیر کی ایک نظم ''دی لسنرز'' پر ہزار جان سے فریفتہ تھے۔ پتہ نہیں اور کب تک ہمیں یہ نظم اپنے سحر کی رنگینیاں دکھاتی کہ منیر کی ''صدا بصحرا'' شائع ہوگئی چھ مصرعوں کی اس ظالم نظم نے ہم سے اتنے بڑے شاعر کا کیسا خوبصورت بیان چھین لیا کس سلیقے سے اس کی ابتدا تھی کس طرح مونولاگ کا حسن نکھرا تھا اور کیسے کیسے الفاظ نے آسیب زدہ ماحول کا تاثر بڑھایا تھا۔ ہم اس کے بیان کو سنتے اور سر دھنتے رہے تھے لیکن منیر نے بات کی اور اس کے بعد ایک لمبی چپ اور ''تیز ہوا کا شور'' کے بول پر ختم کر دی اور پھر یوں محسوس ہوا جیسے بھاری دروازے کے پیچھے اُگی ہوئی گھاس، غلام گردش پر اگی ہوئی جنگلی بیلوں کی لپیٹ میں آ گئی۔ پھر بھاری دروازے کے کھلے ہونے کے زمانے اور بند ہونے کے بعد کی مدت میں اتنے جگ بیت گئے کہ آگے اور پیچھے کا زمانہ ایک ہوگیا ان قرنوں میں اس قلعہ نما پر کیا بیتی ایک داستان ہے جسے اپنی زندگی کے ساتھ طول دیتے جایئے۔[۲]

اس نظم کی مختلف ناقدین نے مختلف تعبیریں کی ہیں خصوصاً صحرا میں بھاری دروازے کا کھلنا عام تفہیم کے سلسلے میں بڑی الجھن پیدا کرتا ہے لیکن اگر اس دروازے کو فطرت کی ازلی جستجو میں نکلے انسان کی راہ میں حائل ایک غیبی یا رازوں بھرا دروازہ بھی کہیں تو غلط نہ ہوگا جو خود مظاہر فطرت بھی ہیں جن میں گھٹاؤں، ہواؤں اور گھپ اندھیروں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے ۔ ان کے پار جا کر بہت کچھ جاننے کی جستجو فطرت کے رازوں کو جاننے اور ان کا قرب حاصل کرنے کی کوشش بھی ہے اور اس کارگہہ حیات میں مشکلوں سے نبرد آزما ہونے کا حیلہ بھی ۔اس نظم کے ابھرتے ہوئے رومانوی پس منظر پر غور کریں تو اس میں ایک ''Eternal She'' کا کردار بہت متاثر کرتا ہے جو اپنے قرب اور حسن کے جویاؤں کو اسی طرح چپ رہ کر خود کو ناقابل حصول بنائے رکھنے پہ مصر رہتی ہے۔ اگر وہ کسی سے ہمکنار ہونا بھی چاہے تو فطری پیش قدمی کسی مہم جو کو خود ہی کرنا پڑتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ صحرا صحرا اس کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔

ایک طرف اتنی اپنائیت ہے کہ شاعر اپنا تعارف اس مکالمے میں صرف ''میں کہتا ہوں میں'' کے مصرع سے کرواتا ہے یقیناً یہ بات کسی ایسے دروازے پر کہی جاتی ہے جہاں ہم بار ہا گئے ہوں یا جو دروازہ ہمارے اپنے ہی گھر کا ہو یا پھر یہ کوئی ایسا دروازہ ہے جہاں کوئی شناسا ہمارا بڑی دیر سے منتظر ہے۔لیکن دروازہ کھلنے اور نہ کھل سکنے کا تذبذب نظم کے اختتام تک جاری رہتا ہے۔کہیں یہ لمبی چپ اور تیز ہوا کا شور،دروازہ کھل جانے کے باعث تو نہیں ۔ یا شاعر ویسا ہی آندھی کی یورش میں تنہا کھڑا ہے۔۔۔۔ بلاشبہ یہ نظم منیر نیازی کی ہمیشہ یاد رہ جانے والی اور متاثر کرنے والی نظموں میں سے ایک ہے۔

**''ہوا کا گیت''** منیر نیازی کی ایسی نظم ہے جس میں ہوا کی حکمرانی اور تسلط کو خود ہوا واحد متکلم کی صورت میں بیان کرتی ہے ۔

مرا راستہ روکنے کی نہ کوشش کرو

میں ہوا ہوں

مری کھوج میں جنگلوں، گلستانوں، پہاڑوں، پرانے مکانوں

میں جاؤ گے تو ایک جانکاہ دکھ کے سوا

اور کچھ بھی نہیں مل سکے گا

ہوا ، یہاں تغیر کے باوجود فطرت کے ازلی تسلسل کو سامنے لاتی ہے جس کی ایک بہت بڑی علامت یہ خود ہے۔ دریا کی روانی سے بھی اسے گہری نسبت ہے کہ ہمیں اس کا منہ زور بہاؤ ذرا سی بھی مہلت نہیں دیتا ۔ہوا اپنا یہ گیت گاتی ہوئی اپنی موج میں مست چلی جاتی ہے کیونکہ اسے یقین ہے کہ انسانی جذبات کی ان جراحتوں کا اندمال ناممکن سی بات ہے جو وقت کی گزران کو پل بھر کو ہی سہی روک لینے یا واپس بلانے کی متمنی ہیں اسی لیے نظم کا اختتام ان سطروں پر ہوتا ہے:

کوئی تم ایسا بھی ہے؟

جو رواں ندیوں، راہ چلتی صداؤں کو بانہوں کے گھیرے میں لے

کر دکھا دے

چلے جانے والوں کو اک بار واپس بلا کر دکھا دے

(جنگل میں دھنک)

ہوا کے معنی ہی اصل میں ایسی چیز کے ہیں جو متحرک ہو اور اپنے کسی ایک مقام پر قائم نہ رہے یہ حرکت اور تموّج ہی اس کے دوام کا باعث ہے۔محمد سلیم الرحمٰن کہتے ہیں

۔۔۔ کہتے ہیں عالم بالا میں ایک بہت پھیلاؤ والا گھنا درخت ہے جس پر ہمیشہ ایک ہی وقت میں خزاں اور بہار چھائی رہتی ہے جب تیز ہوا کے جھونکے آتے ہیں تو کچھ پیلی مرجھائی پتیاں ٹوٹ کر گرتی ہیں اور اسی طرح نیچے دنیا میں جہاں فنا کو قیام ہے فانی انسان مرتے رہتے ہیں۔ یوں مجھے تو ہوا کی آواز میں موت کی ندا سنائی دیتی ہے جو عالم بالا

میں پکار پکار کر ہمارے ناموں کے پتے گراتی رہتی ہے''ٹوٹا پتا ڈال سے لے گئی پون اُڑا'' میں سمجھتا ہوں کہ تمام جدائیوں اور محبتوں اور شکستوں میں ہوا کا ہاتھ ہے۔ ہوا کا سدا بول بالا رہے۔[۳]

اس میں کوئی شک نہیں کہ فطرت کے تسلسل اور زندگی کے تغیر وتبدل میں ایک گہرا ربط ہے کہ انسانی زندگی اپنے تمام تر حسن اور کمالات کے باوجود فطرت کے غیر فانی دھارے پر سبقت نہیں پاسکتی اور اسی جانکاہ احساس کو منیر نیازی نے ہوا کی زبانی بیان کیا ہے۔

نظم **''کوشش رائیگاں''** میں چاند کو ایک نئے انداز سے دیکھا گیا ہے جو دشتِ آسمان کی وسعت کو اپنے تئیں پار کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اپنی گردش کے لیے ملنے والی مہلت اسے یہ کام انجام دینے سے پہلے ہی ختم ہوتی نظر آتی ہے بظاہر وقت اور مہلت کے اختتام کا کوئی لفظی حوالہ اس نظم میں موجود نہیں ہے لیکن آسمان کی بے کنار وسعت میں چاند کے مسافر کی یہ معصوم کوشش ایک طرح سے بے سود ہی ہے کہ چاند آسمان پر موجود بے شمار مظاہر میں سے ایک ہے۔ ستاروں، سیاروں اور سورج کے خاندان میں اس کی حیثیت ایک لطیف اور نازک مظہر کی ہے۔ البتہ اپنی گردش اور نمود حسن سے چاند یہ کوشش رائیگاں کرتا ہوا بھی شاعر کو بہت پرکشش معلوم ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ چاند کو منیر نیازی کی نظم میں ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔

**بے سود سفر کے بعد آرام کا پل**، فطرت کے قرب کی خواہش کو بیدار کرتی ہوئی بڑی اہم نظم ہے جس میں رائیگانی کے احساس کی شدت کو کم کرنے کیلئے شاعر فطرت کی اس ازلی ڈھال کی طرف بڑھتا ہے جو اسے اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے:

پھر ہری بیلوں کے نیچے بیٹھنا شام و سحر
پھر وہی خوابِ تمنا پھر وہی دیوار و در
بلبلیں، اشجار، گھر، شمس و قمر
خوف میں لذت کے مسکن جسم پر ان کا اثر
موسموں کے آنے جانے کے وہی دل پر نشاں
سات رنگوں کے علم نیلے فلک تک پرفشاں
صبح دم سونے محلے پھیکی پھیکی سہ پہر
پھول گرتے دیکھنا شاخوں سے فرشِ شام پر
خواب اس کے دیکھنا موجود تھا جو بام پر
پھر ہری بیلوں کے نیچے بیٹھنا شام وسحر

(دشمنوں کے درمیان شام)

بلبلیں، اشجار، گھر، شمس وقمر منیر نیازی کے نزدیک اپنے گردوپیش پھیلے خوفزدہ ماحول میں لذت حاصل کرنے کے مسکن ہیں، باعثِ سکون واطمینان ہیں اور یہی وہ فطری پناہ گاہیں ہیں جن کی طرف انسان لوٹ جانا چاہتا ہے۔ یہاں موسموں کا آنا جانا صرف

صوّری مناظر کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دلِ شاعر پر اپنے اثرات چھوڑ جاتا ہے۔ فرشِ شام پر گرتے پھولوں کا خوبصورت رومانوی نظارہ پوری نظم کو حسنِ فطرت کی تصویر بنا دیتا ہے اور ذہن معاً سرِ بام کسی مانوس اور آشنا صورت کے خوابوں میں کھو جاتا ہے۔ **''دوست ستارے کو چمکتے رہنے کا اشارہ''** میں منیر نیازی کا رجائی لب ولہجہ ستاروں سے ایک تعلقِ خاص کو ظاہر کرتا ہے جو مظاہرِ فطرت میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور نئی منزلوں کی جانب پیش قدمی کا حوصلہ بھی بخشتے ہیں اسی لیے منیر ان ستاروں کو اپنے ''خوابِ امید کے ستارے'' کہتے ہیں۔

**''آغاز زمستان میں دوبارہ''** ایک ایسی نظم ہے جس میں بدلتے ہوئے موسم کا جسم وجاں پر ہونے والا ایک رومانوی اثر ایک مخصوص کیفیاتی حسن کو سامنے لاتا ہے جسے بیان کرنے سے زیادہ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ نظم کچھ یوں ہے:

غروبِ مہر کا منظر گھڑی ہوئی گزرا
بس ایک پل کو نیستاں اسی طرح لرزا
گیاہِ سبز کی خوشبو اسی زمانے کی
اسی طرح کی مسرت بہار آنے کی
وہی جمالِ درو سقف و بام ہے میں ہوں
کنارِ رودِ سیا فامِ شام ہے میں ہوں

(ماہِ منیر)

آمدِ سرما کی فضائے خنک اپنے اندر ایک رومانوی کشش رکھتی ہے اور ساتھ ہی آمدِ بہار کا ایک انتظار یہ ماحول بھی پیدا کرتی ہے جسے گیاہِ سبز کی خوشبو کا تصور اور بھی راحت فزا بنا دیتا ہے۔

درو سقف و بام ایک جمالیاتی رنگ میں ڈوبے ہیں اور ''رودِ سیاہ فامِ شام'' کی پھیلتی ہوئی تیرگی میں شاعر کا خود سے مکالمہ ایک طرف دل میں انوکھی کسک اور تنہائی کے احساس کو جگاتا ہے تو دوسری اس سحر انگیز فضا کے حسن کو کچھ اور بامعنی بنا دیتا ہے۔

سالِ نو کی آمد کی ایک خوبصورت جھلک نظم **''نیا سال''** میں نظر آتی ہے یہ نظم اپنی پیش کش اور مزاج کے اعتبار سے مغربی شاعری سے بہت ہم آہنگ محسوس ہوتی ہے۔ منیر نیازی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے صرف کیلنڈر بدلنے کو ہی نظم کا موضوع نہیں بنایا بلکہ وقت کی گزران کے احساس سے ایک دل گداز کیفیت پیدا کی ہے یہاں موسم تبدیلی کے ایک ناگزیر اور بتدریج رونما ہوتے ہوئے عمل کی صورت میں ہر خاص وعام کے لیے باعث کشش بھی ہے اور ایک گونہ افسردگی کا حامل بھی ہے۔ فطرت جتنی قدیم ہے اسی قدر ہر آن نئی اور قابلِ توجہ بھی ہے کہ اپنے دامن میں تغیر کے سدا بہار پھول لاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی انداز میں آتے جاتے موسم ہمیشہ ہماری دلچسپی کا مرکز بنے رہتے ہیں سخت سردی کے موسم کی ان موسموں میں خصوصیت یہ ہے کہ یہ نئے سال کو بھی اپنے ہمراہ لاتا ہے اور اس رومان پرور ماحول میں جب لوگ اپنے خارج سے کسی قدر بے خبر اپنے آپ میں اور اپنے ماحول میں

محدود ہوجاتے ہیں یہ پھر سے زندگی کو ایک انگڑائی لینے پر اُکساتا ہے۔ ملاحظہ ہو نظم **''نیا سال''**

نیا سال آیا ہے
ویران صبحوں کی نیلی تہوں سے ابھرتا
خیابان ودشت وجبل کی ٹھٹھرتی خموشی میں برفیلی سیٹی بجاتا
دبے پاؤں آیا
یخ آلود شاموں کی خاموشیاں
اس کے قدموں کی آہٹ سمیٹے
گزرگاہوں پر، سائبانوں میں نوحہ کناں ہیں
درآتی ہے شب کو دریچوں کی درزوں سے
پرشور جھونکوں کی بے مہر ٹھنڈک
برودت زدہ پانیوں پر پرندے
کناروں پہ استادہ پیڑوں کی نمناک شاخوں کی جانب اڑے جارہے ہیں
مکیں آنگنوں میں، چھتوں پر
دھڑکتے دلوں میں ہزاروں خیالوں کی شمعیں جلائے
دبے پاؤں آتے ہوئے سال کو دیکھتے ہیں

(ماہِ منیر)

لیکن ساتھ ہی ایک احساسِ پژمردگی وافسردگی بھی دامن گیر ہے کہ وقت کی تیز رفتاری انسانی اختیار سے کتنی باہر کی چیز ہے گزری ہوئی ساعتوں کی بازیافت محبتوں، قربتوں، رنجشوں اور دوریوں کے سب رنگ سامنے لیے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی تو ہم گزشتہ کے ملال سے ہی نہیں نکل پاتے کہ آنے والے سال کا خیر مقدم کریں ایک ان دیکھے خوف سے دل دھڑکتے ہیں کہ جانے وقت کی یہ صبحِ نو اپنی روپہلی کرنوں کے رنگ کس صورت میں لے کر آئے۔ امید وبیم کی اس ملی جلی کیفیت کا باعث زمانی تسلسل کی اس اگلی کڑی کا آغاز ہی ہے جو اپنے پیچھے لامتناہی سلسلوں کو چھوڑتی آگے بڑھتی چلی جارہی ہے۔

سرد موسم میں اپنی ذات کے حصار میں مقید انسان اس تبدیلی کو قدرے دکھ اور اداسی سے دیکھتا ہے وہ تبدیلی جو اس سرد مہری کی فضا میں دبے پاؤں چلی آئی ہے اپنے آنے کی خوشی سے زیادہ کسی کے چلے جانے کا ملال بڑھا رہی ہے۔ اس سارے منظر میں سرد ہوا کے جھونکے، شام کی خاموشیاں اور پیڑوں کی نمناک شاخوں کی جانب اڑے چلے جارہے پرندے فضا میں ایک گہری اداسی کا

تاثر بڑھادیتے ہیں البتہ آنگنوں کی چھتوں پہ کھڑے لوگوں کی ''ہزاروں خیالوں کی شمعیں'' ایک امید افزا امیج پیدا کرتی ہیں۔

نظم **''چھ رنگین دروازے''** میں منیر نیازی پھول کو خوشی اور امید کا ایک ایسا دروازہ کہتے ہیں جس کے پیچھے اور بہت سی معنوی مسرتیں پنہاں ہیں۔ اس نظم میں یہ پھول چھ رنگوں پہ مشتمل ہیں جو چھ اطراف کی ایک تمثیل بھی ہیں۔ ہر سمت اپنے اندر دیگر بہت سی سمتیں اور جہتیں رکھتی ہے۔ کئی معلوم اور غیر معلوم مقامات وامکانات ان منظروں کے پیچھے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں:

چھ رنگوں کے پھول کھلے ہیں
میرے گھر کے آگے
کسی نئے سکھ کے دروازے
خواب سے جیسے جاگے
ان کے پیچھے رنگ بہت ہیں
ان کے پیچھے شہر بہت ہیں
اور بہت دروازے

(چھ رنگین دروازے)

فطرت کے رنگ پھولوں میں ڈھل کر ہر طرف سے امید اور رجائیت کا انداز لیے ہوئے ظاہر ہوتے ہیں جس کے باعث دل واقعتاً مسرتوں کے کئی نادیدہ شہروں اور دروازوں کے کھوج میں نکل جانے کو چاہتا ہے۔ نظم **''ایک منظر''** میں یہ امیج کچھ اس طرح ابھرتا ہے۔

سات کلیاں سنگترے کے پیڑ سے جھڑ کر گریں
صاف چٹیل گوشۂ گلشن کی ویراں راہ پر

(چھ رنگین دروازے)

فطرت کے معصوم پیامبر، یہ پھول اور کلیاں بعض اوقات شاخوں پہ ہوتے ہوئے وہ احساس تغیّر پیدا نہیں کرتے جو ٹوٹ کر گرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم میں گوشۂ گلشن کی ویراں راہ پر یہ معصوم افتادگی ماحول میں اپنے ہونے کا احساس دلا رہی ہے۔ شاعر کی توجہ اس قدر خوبصورتی سے اس کیفیت کو نظم کرتی ہے کہ منظر آنکھوں کے سامنے مصوّر ہوجاتا ہے۔

**''صبح صادق کا پھیلاؤ''** بڑی سحر انگیز نظم ہے جس میں صبح کا لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہوتا منظر شاعر کے پیشِ نظر ہے:

اذاں مسجدوں سے اٹھی جس گھڑی
ہواؤں کے دل اور گہرے ہوئے

کنارے فلک کے گلابی ہوئے
گلابی سے پھر وہ سنہرے ہوئے

(چھ رنگین دروازے)

حسنِ فطرت کی پاکیزگی کو صدائے اذانِ صبح کے سرور آگیں لحن کے باعث ایک عجیب ملکوتی پس منظر عطا ہوتا ہے اور پھر ذرا سی دیر میں سارا منظر صبحِ صادق کے جلو میں پھیلتا چلا جاتا ہے۔

**''راولپنڈی میں شروع سال کی بارش''** میں موسم کی پہلی بارش کا سارا حسین منظر پیشِ نظر ہے جو بلاتخصیص سارے ماحول کو اپنے حصار میں لے رہا ہے۔ اور سال کے نئے مہینے بارش میں بھیگ رہے ہیں۔

**''سورج گرہن کے دن''** میں موسم کے تیزی سے بدلنے کے عمل کو بڑے منفرد انداز میں پیش کیا گیا ہے اور یہاں اسی تبدل اور تیزی کے پیشِ نظر مصرعے بھی ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

اسی حوالے سے نظم ''ایک منظر'' فطرت کے حسن کی نمائندگی کرتی ہوئی ایک خوبصورت امیج تخلیق کرتی ہے۔

گھاٹ پر ہوا چلتی ہے
کیکروں پر پھول کھلتے ہیں
شام سجی سی لگتی ہے

(ایک دعا جو میں بھول گیا تھا)

خوف، دہشت اور پراسراریت منیر نیازی کی نظم کا بڑا منفرد حوالہ ہے۔ مافوق الفطرت عناصر، جادوئی مناظر اور ایک عجیب طلسماتی فضا، اکثر یہ ہوا ہے کہ منیر نیازی کی نظم کے اس پہلو کی تعبیر خوف وہراس کے ظاہری پہلو کو سامنے رکھ کر کی گئی جس سے یقیناً بہت سی الجھنیں پیدا ہوئیں مثلاً ایک عمومی تاثر تو یہی پیدا ہوا کہ منیر کے ہاں چھل پیریاں، چڑیلیں اور آسیب ایک ایسی دہشت ناک صورتحال میں ظاہر ہوتے ہیں کہ مجموعی طور پر ایک خوف کے سوا کوئی تاثر نہیں ابھرتا۔ کہنے والوں نے تو یہاں تک کہا کہ منیر خوف زدہ شاعر ہے اور اپنے گردوپیش بسے لوگوں کو بھی اسی خوف میں مبتلا کر دینا چاہتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض قارئین کی یہ رائے اپنی حد تک درست ہو لیکن اس سے منیر کی نظم میں خوف اور پراسراریت کی اصل جہتیں کہیں پس منظر میں چلی گئی ہیں اور ایک عمومی تاثر ہی زیادہ نمایاں ہوتا نظر آیا ہے۔

بنظر غائر دیکھیں تو منیر کے ہاں صورت پذیر ہوتی یہ پراسراریت اپنے اندر معنی کی گہری تہیں رکھتی ہے۔ انسان کے خلاف برسرِ پیکار کائنات کی منفی قوّتیں اور کہیں خود اس کے اپنے ہی مسخ شدہ باطنی رویے کبھی آسیب کی تجسیم میں ڈھلتے ہیں اور کہیں چڑیلیں بن کر اس کا تعاقب کرتے ہیں اور انسان ہے کہ تنہا ان دہشتوں سے نبردآزما ہے۔ اور ستم بالائے ستم کہ اس کی تنہائی صرف خارجی سطح پر ایک معاشرے یا کسی محبوب ہستی سے بچھڑ جانے کے باعث پیدا ہونے والی تنہائی نہیں ہے بلکہ ایک ایسی مہیب اور کُلّی

تنہائی ہے جس میں اس کے مذہبی اور روحانی رشتے بھی کمزور پڑنے لگے ہیں۔تشکیک کا عذاب عدم تیقّن کے خوف سے ہم آمیز ہو رہا ہے اور ان تباہ حال منظروں میں معبدوں کے چراغ بھی گل ہوگئے ہیں۔ ایسے میں ایک خوف زدہ شخص ویران درگاہوں اور ٹھنڈے مزاروں کے درمیان ایک عالمِ حیرت میں مبہوت کھڑا ہے۔ وہ جو ازل سے ہے ،اس کی بزرگی کا احساس دل میں جاگزیں اور اسی کی عظمت اور جلال ہر جگہ کارفرما ہے۔لیکن خالی پن کی اس اتھاہ میں خوف ایک ایسی متزلزل کیفیت کو بار بار ابھارتا ہے کہ گہرے سنّاٹوں میں صرف اپنے ہی قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے اور تنہائی کے اس گنبد سے ٹکراتی اپنی ہی صداؤں کی بازگشت صورت حال کو اور بھی ہول ناک بنا دیتی ہے۔

اصل مسئلہ ایک ناقابلِ برداشت تنہائی ہی ہے جو ماحول کی عدم مطابقت اور غیر ہم آہنگی سے پیدا ہوئی ہے۔ ہر زمانے کے فنکار اور تخلیقی انسان کو یہ مسئلہ در پیش رہا ہے لیکن اس پیش کش کے انداز مختلف رہے ہیں۔منیر نیازی کی نظم جب اپنے عہد کے انتشار کو سمیٹتی ہے تو اس میں صرف عصری صورتِ حال ہی نظر نہیں آتی بلکہ ہر ستم رسیدہ زمانے کی جھلکیاں جہاں تہاں لمحہ موجود سے اپنا ایک رابطہ بنانے کیلئے ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

ظلم وتشدد، بربّریت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے کسی اور اضطراب ان نظموں کا خاص موضوع ہے جو صرف ایک بیرونی اور خارجی تضاد ہی نہیں دکھاتا ،نئے دور کے حسی اور نفسیاتی اضطراب کو بھی سامنے لاتا ہے۔ انسان کا وجود ایک ہستی ایک شخصیت اور حیثیت سے بدل کر اب ایک معروضی اکائی میں ڈھلنے لگا ہے اور یہی معروضیت داخلی اور باطنی سطح پر کھوکھلے رویوں کو سامنے لاتی ہے۔ نتیجتاً انسان خود کو معاصر کشمکش میں تنہا اور بے امان محسوس کرتا ہے یہ ایسی ہی تنہائی اور بے امانی ہے جو کبھی اس کائنات میں انسانوں کی پہلی پہلی نسلوں کے حصے میں آئی ۔ یوں دیکھا جائے تو منیر کی نظم میں خوف کی صورت حال از منہ قدیم سے ایک تلمیحی اور اساطیری مماثلت بھی رکھتی ہے اور اپنے عہد کے مظالم بھی اس کا باعث ہیں۔منیر نیازی کی نظم میں خوف واسرار کی یہ پیش کش کن مختلف زاویوں سے سامنے آتی ہے یہاں اس کا ایک تفصیلی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس سلسلے کی نظموں میں ''لیلیٰ'' ''آتما کا روگ'' ''پاگل پن'' ''ایک آسیبی رات'' ''موسمِ بہار کی دوپہر'' ''بھوتوں کی بستی'' ''چڑیلیں'' ''جنگل میں زندگی'' ''جنگل کا جادو'' ''ویران درگاہ میں آواز'' ''دھوپ میں ایک غیر آباد شہر کا نظارہ'' اور ایک بھاری رات،خصوصی اہمیت کی حامل نظمیں ہیں۔

نظم **''آتما کا روگ''** میں ہند دیومالا کے پس منظر میں روح کی ناآسودگی کی دل خراش کیفیت سامنے آتی ہے۔ دیوتاؤں کا شراپ اس اکیلی روح کا نصیب ہے جسے منیر نیازی ''رادھیکا'' کی تجسیم میں دکھا رہے ہیں۔ یہی وہ کردار ہے جو عام گوپیوں میں ہونے کے باوجود اپنی الگ شناخت، حیثیت اور مقام کو پہچان لیتا ہے اور یہ تفہیم یقیناً اسے محبت کا جذبہ عطا کرتا ہے وہ محبت جو صرف (Divine Reverence) نہیں زمینی اور جسمانی پہلو بھی رکھتی ہے۔لیکن مذہبی اداروں پر متمکن ''مہاتما'' اس کی یہ آزاد روی پسند نہیں کرتے کہ وہ کرشن سے ہم سطح ہونے کا احساس رکھے دیوتاؤں کا شراپ اور اکیلی رادھیکا کا دکھ کی آگ میں جلنا دو ایسے نکتے ہیں جن کے گرد ساری نظم بُنی گئی ہے۔ پورا ماحول اسی Curse اور سوز کے باعث دکھ کی آگ میں جلتا محسوس ہوتا ہے۔

ایک گہری اداسی ہے جس میں پرانے مندروں میں بسیرا کرنے والی ''اپسرائیں'' تک اداس ہیں جو بنیادی طور پر شوخی چنچل پن اور رقص وسرود کی علامت ہیں یہاں وہ بھی ایک ناآسودہ روح کے غم میں شریک ہیں۔ یہی گہرا تاسف خاموشی اور سناٹے کے احساس کو بڑھانے لگتا ہے اور تیز چلتی ہوئی ہوائیں بنوں کو اپنی سائیں سائیں سے اور بھی دہشت ناک بنا رہی ہیں۔ کرشن کو ایک جسم کہیں تو روح رادھیکا ہے جو اس سے بچھڑ کر اضطراب اور بے چینی میں مبتلا ہے اس کو ملنے والا شراپ محبت کرنے والی ہر ناآسودہ روح کا مقدر ہے جسے آسانی سے مذہبی اور معاشرتی اجارہ داریوں (Taboos) پابندیوں کی آشیر باد حاصل نہیں ہوتی۔

**''ایک آسیبی رات''** اپنے عنوان کی نسبت سے ہی ایک خوفناک اور آسیب زدہ تاثر لیئے ہوئے ہے لیکن اس نظم پہ آسیبی فضا ایک گہرا علامتی مفہوم بھی رکھتی ہے جس سے یہ خوف صرف خارجی سطح کا خوف نہیں رہ جاتا بلکہ اپنے اندر چھپے اس گہرے طنز کا اظہار کرتا ہے جو ہمارے گردوپیش پھیلے عفریتوں اور آسیبوں کے ظلم وتشدد اور قتل وغارت گری کے بعد پیدا ہوا ہے۔

منیر نیازی کے ہاں یہ آسیب اور بھوت ورائے واقعیت (Supernatural) کے پردے میں دراصل کچھ ایسے منفی کردار ہیں جنہوں نے پورے ماحول کو تباہ وبرباد کر دیا ہے۔

آسیبی رات ہماری زندگی پہ چھائی ہوئی وہ ظلم کی سیاہ رات ہے جس میں کوئی گھر سے نکلے تو واپس اپنے قدموں پر چل کر نہیں آتا اور طرّہ یہ کہ خود قاتل ہمارے ہمدرد ہونے کا ڈھونگ بھی رچاتے ہیں۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ ان کی شکلیں کتنی مکروہ اور گھناؤنی ہیں۔

اس نظم میں شاعر کا راستہ ٹوکنے والا بھوت یہ کوشش کرتا ہے کہ ''لیلیٰ'' کو وہ ڈھونڈنے مت نکلے ''لیلیٰ'' محبوبہ ہے اور حسن کا استعارہ ہے وہی حسن جسے تمام منفی طاقتیں مل کر مسخ کرنے میں لگی ہیں۔ یہ عمل ظالمانہ ہی نہیں سفّاکانہ بھی ہے کہ غارت گروں کو اپنے کیے پر احساس تفاخر بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کے حسن کی تلاش میں نکلنے والے اور اسے ہوس کے دندانِ آز سے بچانے کی کوشش کرنے والے معصوم تخلیق کار کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ شاعر کی آواز ''لیلیٰ لیلیٰ'' ہر سمت گونجتی ہے لیکن کوئی جواب آنے کی بجائے بازگشت میں وہی آسیبی آوازیں پلٹ پلٹ کر ''لیلیٰ'' کا نام دہراتی ہیں جس سے خوف، دہشت اور بے بسی کا شدید تاثر پیدا ہوتا ہے۔

نظم **''بھوتوں کی بستی''** میں ہم چند ایسے کرداروں سے متعارف ہوتے ہیں جو زندگی میں نامرادی اور ناآسودگی کی انتہا کے باعث متشدد اور خوفناک ہوگئے ہیں۔ اُن کے منہ موت کی مانند زرد ہیں اور آنکھیں وحشت ناک ہوگئی ہیں۔

اب یہ لوگ بجائے خود خوف بن گئے ہیں ان کے جسموں سے خونخواری سرخ لہو کے دھبے بن کر ابھر رہی ہے۔ طاقت اور اقتدار کی علامت آگ ان کے سروں پر جلتی نظر آتی ہے۔ ان کے اتھاہ گہرائیوں کے خالی دل ایک بے آباد مکان کی طرح بے رونق اور ناشاد ہیں جنہیں شاعر نے ان کی خواہشوں کا ایک لمبا قبرستان کہا ہے۔

یہاں شرفِ انسانیت سے محروم ہوجانے والوں کو منیر نیازی بھوتوں کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پوری نظم

کی فضا ورائے واقعیت کے زیر اثر رہتی ہے اور مجموعی تاثر اسی فضا کے باعث دہشت کا پیدا ہوتا ہے۔

منیر نیازی کی نظم **"چڑیلیں"** بھی اپنی فضا کے اعتبار سے کچھ اسی قسم کی نظم ہے۔

گہری چاندنی راتوں میں یا گرمیوں کی دوپہروں میں
سونے تنہا رستوں میں یا بہت پرانے شہروں میں
نئی نئی شکلوں میں آکر لوگوں کو پھسلاتی ہیں
پھر اپنے گھر لے جا کر ان سب کو کھا جاتی ہیں
اسی طرح وہ گرم لہو کی پیاس بجھاتی رہتی ہیں
جسم کی خوشبو کے پیچھے دن رات بھٹکتی رہتی ہیں
لال آنکھوں سے راہ گیروں کا رستہ تکتی رہتی ہیں

(جنگل میں دھنک)

مسافروں اور راہ گیروں کا راستہ روکنے والی منفی قوتیں یہاں چڑیلوں کی تجسیم میں سامنے آتی ہیں۔ اس بات سے قطع نظر بھی ہماری اپنی معاشرت اور ثقافت میں ایسا مزاج اور ماحول موجود ہے جہاں مافوق الفطرت عناصر کے اچانک ظاہر ہوجانے یا ان کے انسانی دل ودماغ پر قابض ہونے کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا بلکہ اسے ایک طرح کا اثبات حاصل ہے۔ علاوہ ازیں انسانی زندگی میں ان کی (Psychologcal Acceptance) سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے سارے داستانوی ادب میں انہی مافوق الفطرت عناصر کو کسی نہ کسی صورت میں سرگرم عمل دکھایا گیا ہے۔ غیر معمولی اور ناقابلِ یقین طاقت کے ساتھ۔ جو انسانی حدوں سے باہر ہے لیکن پھر انسان ان عناصر پر اپنے شرفِ انسانیت کی بدولت کہیں تو اس پہ سبقت پاتا ہوا نظر آتا ہے اور کہیں اپنے اعلیٰ اوصاف سے محروم ہونے کے باعث ان کے سامنے پسپائی اختیار کر لیتا ہے لیکن یہ انداز منیر نیازی سے پہلے جدید اردو شاعری میں اس طرح نمایاں نہیں ہوا البتہ انگریزی رومانوی شاعری کی روایت اس سلسلے میں خاصی توانا ہے اور ہمیں مابعد الطبیعاتی شعرا (MataPhysical poets) کے بعد جدید رومانوی شاعری تک یہ مضمون مختلف انداز سے نظر آتا ہے جس میں یہ منفی طاقتیں مسافروں کو اپنی منزل سے بھٹکا دیتی ہیں یا کم از کم ان کے دل میں منزل پہ نہ پہنچ سکنے کا وہم ضرور ڈال دیتی ہیں۔

نظم **جنگل کا جادو** میں بڑی عجیب صورت حال در پیش ہے یہاں دہشت کی امیجری اتنی بھرپور ہے کہ پورا منظر ہولناک اور خون آشام نظر آتا ہے۔

جس کے کالے سایوں میں ہے وحشی چیتوں کی آبادی
اس جنگل میں دیکھی میں نے لہو میں لتھڑی اک شہزادی
اس کے پاس ہی ننگے جسموں والے سادھو جھوم رہے تھے
پیلے پیلے دانت نکالے نعش کی گردن چوم رہے تھے

ایک بڑے سے پیڑ کے اوپر کچھ گدھ بیٹھے اونگھ رہے تھے
سانپوں جیسی آنکھیں میچے خون کی خوشبو سونگھ رہے تھے

(جنگل میں دھنک)

منیر نیازی نے یہاں دوا نتہائی منفرد امیجز تخلیق کیے ہیں جو فکری اور معروضی سطح پر اپنی اصل سے متصادم ہیں ان میں سے ایک تو ''وحشی چیتوں کی آبادی'' ہے اور دوسرا سادھوؤں کا نعش کے پاس جھومنا اور اس کی گردن چومنا ہے۔ ''وحشی چیتوں کی آبادی'' ہماری بسائی گئی وہ آبادی ہے جہاں اخلاقیات نام کی کوئی چیز نہیں ہے ''چیتے'' اگر آبادیوں میں آ بھی ''بسیں'' تب بھی وہ تمدنی زندگی کے آداب سے ناواقف ہی رہتے ہیں اور ان کی خونخواری کی جبلّت انہیں غارت گری پر اکساتی رہتی ہے۔

نظم میں دہشت کا پہلا امیج تو نسائیت پر ایک وحشیانہ حملہ ہے جہاں ایک ''شہزادی'' خون میں لتھڑی نظر آتی ہے لیکن اس نظم کو صرف تشدد یا جنسی تشدد کے حوالے سے دیکھنا اس کے معنی محدود کر دینے کے مترادف ہوگا۔ ''شہزادی'' کا لفظ اس میں عورت کو ایک عام عورت سے ممتاز کرتا ہے جو شاید راہ بھٹک کر درندوں کے درمیان آ گئی یا زبردست لے آئی گئی۔ اس زاویہ فکر کے ساتھ ہی اس شہزادی کا امیج جسمانی سطح سے Shift ہوکر زمینی اور تہذیبی رنگ اختیار کرتا ہے یہ ایک تانیثی حوالہ بھی ہے اور ہمارے سطوت ووقار کی علامت بھی۔ جو غارت گروں کے ہاتھوں پامال ہے یہ حملہ آور بیرونی ہوں یا مقامی ان کے ہاتھوں ہماری تہذیب کی شہزادی لہولہان ہے۔ سادھو جو برہمن کے برعکس ایک بڑا مثبت کردار ہے اور جوگی یا صوفی کی مانند جنگلوں میں مراقبے کرتا ہے۔ حیرت ہے کہ وہ بھی اس ''جشنِ عیش'' میں شامل ہے شاید منیر نیازی سے پہلے علامہ اقبالؔ نے اسی لیے ملاوصوفی کو شک کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ لیکن منیر نیازی کے ہاں تو سادھو کی تمام تر ریاضت اور تپسیا اکارت ہوتی نظر آتی ہے شاید اس لیے کہ اپنی تمام تر فنا پرستی کے باوجود سادھو، ہے تو ایک مذہبی علامت اور اس دورِ بربریت میں اس کی بے نیازی اور درویشی سے بھی ایمان اٹھنے لگا ہے۔ جو کسی ظلم کے آگے روک تو کیا لگائے گا خود اس جشنِ مرگ میں شامل ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قاتلوں کو اس کی آشیر باد بھی حاصل ہے نعش کے گرد جھومنا تو اس کے خود قاتل ہونے کی بھی دلیل ہے لیکن پیلے پیلے دانت نکالے نعش کی گردن چومنے کا خوفناک امیج اس کی طرف سے ملنے والی ''مذہبی ہمدردی'' کی منافقانہ تصویر بھی ہے کیونکہ یہ اکثر ہوا ہے کہ ظلم وستم کا بازار گرم کرنے والوں نے تاریخ کے کئی نازک موڑوں پر اسی طرح مذہبی پیشواؤں کو اپنا آلہ کار بنایا ہے۔ اس نظم کے کینوس میں ایک بہت بڑا درخت ہے جو پس منظر میں ہے اور بڑی تعداد میں موجود بے عمل لوگوں کی آماجگاہ ہے۔ جنہیں شاعر نے گدھ کی صورت میں دکھایا ہے یہ لوگ تو اپنے کھانے پینے کی خاطر کسی قسم کا کوئی ڈھونگ تک نہیں رچا سکتے۔ بلکہ یہ تو کھا بھی سکتے ہیں تو صرف مردار چاہے وہ کوئی ایک مردہ جسم ہو یا پوری تہذیب وتمدّن کی نعش۔

نظم ''خالی مکان میں ایک رات'' اور ''ویران درگاہ میں آواز'' ملتی جلتی نظمیں ہیں جن میں بیک وقت خوف اور پراسراریت کی کیفیت کا احساس ملتا ہے کسی کے ہونے اور نہ ہونے کا احساس اور دلوں میں اترتا ہوا مہیب سناٹا دونوں نظموں میں تنہائی کے

باعث پیدا ہونے والے گہرے خوف کی فضا پیدا کرتا ہے۔ پہلے ملاحظہ ہو نظم ''خالی مکان میں ایک رات''

بادل سا جیسے اڑتا ہوا ایسی صدا سنی
آواز دے چھپ گیا اک سایہ سا کوئی
جب لالٹین بجھ گئی کوئی ہوا نہ تھی
سردی تھی کچھ عجیب سی ٹھنڈے مزار سی
بیمار سی مہک تھی کسی خشک ہار کی
پھوٹی کرن کہیں سے نگاہوں کے زہر کی
باہر گلی میں چپ تھی کسی اجڑے شہر کی

(جنگل میں دھنک)

ایک خالی اور ویران مکان کی یہ پراسرار فضا شاعر کی اپنی ذات کے مکان کی طرف اشارہ کرتی ہے جو بہت خالی ہے اس بات کو منیر نیازی کے ہاں Loss of faith یا پھر Lack of faith کے حوالے سے سمجھا جاسکتا ہے وہ کون ہے جو سامنے نہیں آتا اور اسے تلاش کرنے کا معروضی حوالہ جو اس نظم میں لالٹین ہے اندر کی وہ روشنی ہے جو جلتے جلتے بجھ گئی ہے کمزور پڑتے ہوئے مذہبی عقائد کے حامل اس معاشرے میں شاعر کو ٹھنڈے مزار کی تشبیہ سوجھتی ہے جو بڑی مناسبِ حال ہے ایسا مزار جہاں نہ زائرین آتے ہیں نہ ہی قیام وطعام کا سلسلہ ہے۔ خشک پھولوں کی مہک اس ویرانی کے احساس کو بڑھاتی ہے جو کبھی یہاں کسی کے آنے کی گواہی بھی دے رہے ہیں۔ دوسرا اہم حوالہ مزار کی ٹھنڈک کو موت سے مشابہ قرار دینے سے سامنے آتا ہے۔ لگتا ہے اپنے باطن میں کوئی موت ہوگئی ہے۔ اور پھر خارجی سطح کی اداسی اس باطنی کیفیت سے ہم آہنگ ہوجاتی ہے، نگاہوں کا زہر اس تلخ حقیقت کو پالیتا ہے کہ ویرانی ہر سطح پر موجود ہے۔ اپنے عہد کے روحانیت سے خالی ہونے کی طرف بھی ''ٹھنڈے مزار'' کی یہ فضا بڑا اہم اشارہ کر رہی ہے۔ اب ملاحظہ ہو نظم **''ویران درگاہ میں آواز''** کا ایک ٹکڑا

''کون ہے''
کون ہے؟ میں اک عجب موجودگی سے ڈر گیا
جیسے کوئی تھا وہاں پر، پھر بھی وہ روپوش تھا
کون ہے؟ .....کون ہے؟ .....کون ہے؟.....
یوں جواب آتا رہا جیسے کوئی بے چین لے
''کیا یہاں کوئی نہیں ہے''

میں نے پھر ڈر کر کہا
''کوئی ہے، کوئی نہیں ہے'' دیر تک ہوتا رہا

(جنگل میں دھنک)

یہاں بھی پہلی نظم کی طرح کسی کی پراسرار موجودگی کا احساس ہوتا ہے لیکن دراصل یہ کیفیت گہرے سناٹے تنہائی اور خالی پن کے باعث پیدا ہوتی ہے اور بار بار اپنے ہی قدموں کی چاپ سے دل ڈرنے لگتا ہے۔ ان نظموں کو اگر رابرٹ فراسٹ کی نظم Bereft کے ساتھ رکھ کر دیکھیں تو خوف کی تنہائی کے باعث پیدا ہونے والی یہ صورت حال مزید واضح ہوتی ہے۔

Summer was past and the day was past

Sombre clouds in the west were massed.

Out on the porch's sagging floor,

Leaves got up in a coil and hissed,

Blindly struck at my knee and missed.

Something sinister in the tone

Told me my secret must be known:

Word I was in the house alone

Somehow must have gotten abroad,

Word I was in my life alone,

Word I had no one left but God.[۴]

اس نظم کی آخری لائنیں خدا کے وجود کے اثبات پر مجبور ایک ایسے شخص کو سامنے لاتی ہے جو تنہائی کی جان لیوا اور ڈرا دینے والی کیفیت میں مبتلا ہے اس کے گرد وپیش کے تمام مقامات اسی تنہائی کے باعث ہو کا عالم پیش کرتے ہیں۔ منیر نیازی کے ہاں بھی باطنی تشکیک کا عذاب کچھ ایسے ابھرتا ہے کہ Philip Larkin کی نظم Church Going کا بھی خیال آتا ہے جس میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ معاصر زندگی کی مادہ پرستی اور روحانی سطح پر ایک خالی پن سے مذہبی عقائد کو بھی دھچکا لگا ہے۔ منیر نیازی کی نظموں کی خاصیت یہ ہے کہ یہاں Church giong کی طرح Religious reverence پر طنز کی کیفیت نظر نہیں آتی بلکہ اس کے برعکس انسان کے ظاہر و باطن میں پھیلا ہوا سناٹا کسی کے موجود ہونے کے امکان کو بھی ابھارتا ہے۔

منیر نیازی کی نظموں میں خوف واسرار کے حوالے سے پائی جانے والی معنویت کی جتنی جہتیں سامنے آتی ہیں ان میں تنہائی روحانی ناآسودگی اور اپنے گردوپیش بسے اجنبی معاشرے کی بے حسی اور ظلم خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ظلم وتشدد کو جب ہم مقتدر طبقے کی طرف سے روا دیکھتے ہیں تو خوف کا سارا منظر نامہ اور بھی بھیانک ہوجاتا ہے۔ دوستی، خلوص، محبت اور اعتبار جیسی اقدار معاشرے میں اس قدر ناپید ہیں کہ بسے بسائے شہروں پر جنگلوں کا گمان ہوتا ہے اور پھر روح تنہائی کے ایسے کرب میں مبتلا ہوتی ہے کہ انسان اپنے ہونے تک کے بارے تشکیک اور خوف کا شکار ہوجاتا ہے۔

## حوالہ جات


۱۔ مجید امجد، تعارف (جنگل میں دھنک) مشمولہ، کلیاتِ منیر، لاہور، ماورا پبلشرز، ۲۰۰۵، ص۱۵۰

۲۔ اشفاق احمد، سرکہسار (تیز ہوا اور تنہا پھول) مشمولہ، کلیاتِ منیر) لاہور، ماورا پبلشرز، ۲۰۰۵ء، ص۴۳

۳۔ محمد سلیم الرحمٰن، تعارف دشمنوں کے درمیان شام، مشمولہ کلیات منیر، لاہور، ماورا پبلشرز ۲۰۰۵ء، ص۲۷۰

4. Robert Frost, Collected poems of Robert Frost, Henry Holt and company, university of California, page 317, 1939